تفہیم غالب کی نئی جہت

ڈاکٹر ممتاز کلیانی*

Abstract

This paper reveals a new aspect of Ghalib's poetry. The newness comes from Ghalib's observation and knowledge of scientific truths to which he refers in his poetic images, metaphors and symbols. Therefor, no reference has been made to this aspect of Ghalib's language and expression. In this paper, data has been presented from some verses to indicate Ghalib's grasp of scientific truths of his time.

غالب اُردو کے کلاسیکی غزل گو شعرا میں فکر و خیال کی ندرت کے باعث منفرد شاعر ہے اُس کی شاعری روایتی مضامین کے بیان کے ساتھ ساتھ آفاقی اور کائناتی حقائق کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔اس کے تخیل کی جولان گاہ میں جذبہ و احساس کی نیرنگی کے ساتھ ساتھ فلسفہ و سائنس کی آفاقی صداقتیں بھی جلوہ گر دکھائی دیتی ہیں۔غالب اُردو کے کلاسیکی شعرا میں واحد شاعر ہیں جس کے بہت سارے اشعار کے مضامین جدید سائنس کی صداقتیں اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔غالب کے مطالعہ، مشاہدہ اور حسیات نے شاعرانہ صداقتوں کو سائنسی صداقتوں کے ساتھ ہم آہنگ کر کے اپنی انقلابی فکر کو بقائے دوام کے دربار میں اونچی مسند پر باتمکین کر دیا ہے۔تفہیم غالب کی اولین کوشش (۱) سے لے کر بیسویں صدی کی تیسری دہائی کی معرکتہ الآرا تحریر (۲) اور بعد ازاں متعدد غالب شناسوں کی تشریحی و تنقیدی بصارتوں نے معانی و مفہوم کی وہ پرتیں بوجوہ نہیں کھولیں جو اَب اس زمانے میں کلامِ غالب سے استخراج کی جا رہی ہیں (۳)۔

شاعرانہ صداقتوں اور سائنسی صداقتوں کی ہم آہنگی کی بحثوں (۴) کے اطلاق میں اُردو شعرا میں سے غالب اور اقبال ہی دو ایسے شعرا ہیں جن کے کلام کے اندر سائنسی صداقتیں موجود ہیں۔اب اس زمانے میں شاعری میں سائنسی صداقتوں کی طرح سے سوچ و خیال کی صداقتوں کی موجودگی کو کلام کے معنوی و صوری حسن و خوبی کا مظہر قرار دیا جا رہا ہے۔اُردو شعر و ادب کے تمام سرمائے میں غالب وہ پہلے شاعر ہیں جن کے تجربے اور مشاہدے نے آفاق کی وسعتوں کو ٹھوس اور مدلل انداز میں دیکھنے کی سعی کی ہے اور اپنے بعض تخلیقی تجربوں میں وہ بے حد کامیاب بھی

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان۔

رہے ہیں۔اگر چہ ان کے اس طرح کے تجربات کی تفہیم غالب کی مشکل پسندی کے باعث عوام الناس تک نہیں ہوسکی اوراس سلسلہ میں ان کے بعض شارحین نے بھی خاصی گمراہی پھیلائی ہے تاہم زیر بحث عنوان کے تحت غالب کے درج ذیل اشعار کی معنوی پرتیں سائنسی علم کی صداقتوں سے ہم آہنگ ہوکر دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔غالب کے کلام کے اس طرز کے مطالعے سے پہلے غالب کے منتخب اشعار سے متعلق بعض اہم شارحین کے تفہیمی مطالعات کو تقابلی مطالعے کے طور پر پیش نظر رکھا گیا ہے تاکہ تفہیم غالب کی نئی جہت نمایاں طور پر سامنے آسکے۔اس مقالے میں تقابلی اور تفہیمی مطالعے کے لیے جن شارحین کو شامل کیا گیا ہے اُن کی تعداد پانچ ہے۔ان میں سے جدید عہد کے شارحین کے ہاں غالب کے ایک آدھ شعر کی شرح سائنسی مشاہدے کو لیے دکھائی دیتی ہے لیکن وہاں بھی پورے سائنسی تجرباتی اور تجزیاتی عمل کے ادراک اور شعور کی کمی کا تاثر موجود ہے۔

شعرنمبر(۱)

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا
بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

(دیوانِ غالب،غزل نمبر۳۲،شعرنمبر۱)

شرح-۱

یعنی گھر رونے کے سبب سے دریا ہورہا ہے نہ روتے تو صحرا ہوتا۔(شرح دیوان اُردوئے غالب،سیّدعلی حیدرنظم طباطبائی،ص۳۴)

شرح-۲

فرماتے ہیں گھر کی ویرانی تو ہر صورت میں ہوتی۔روئے ہیں تو اشکوں کے دریا نے اسے ویران کردیا۔نہ روتے تو بھی اسی طرح ویران ہوتا۔جس طرح سمندر کے خشک ہوجانے پر چٹیل میدان باقی رہ جاتا ہے۔دوسرے مصرع میں جو ثبوت پیش کیا گیا ہے وہ ناقابل انکار ہے۔ (شرح دیوانِ غالب،جوش ملسیانی،ص۹۷)

شرح-۳

ہمارے گھر کی ویرانی تو ہر حال میں مقدر تھی،اس میں ہمارے رونے کا کوئی دخل نہیں اب تو سمجھا جاتا ہے کہ ہمارے رونے سے سیل آگیا اور گھر تباہ ہوگیا،لیکن اگر ہم ضبطِ گریہ سے کام لیتے تو گھر پھر بھی ویراں ہوجاتا۔اس کی

مثال یوں سمجھنی چاہیے کہ سمندر سمندر نہ ہوتا اور اس کا پانی بالکل خشک ہو جاتا تو اس کی جگہ بیاباں نکل آتا جہاں خاک اُڑتی، پانی کی فراوانی بھی بربادی کا باعث ہے اور پانی کے ناپید ہو جانے کا نتیجہ بھی بربادی کے سوا کچھ نہیں۔ (نوائے سروش، غلام رسول مہر، ص ۱۲۴)

شرح-۴

ناصح کہتا ہے کہ اگر تم اس کثرت سے گریہ وزاری نہ کرتے تو تمہارا گھر ویران نہ ہوتا۔ اس کے جواب میں غالب کہتے ہیں کہ ہم چونکہ عاشق ہیں اس لیے ہمارے گھر کی ویرانی بہرحال لازمی ہے اب شدتِ گریہ سے گھر ویران ہو گیا نہ روتے تو دشت نوردی اختیار کر لیتے اور ہماری عدم موجودگی میں ہمارا گھر ویران ہو جاتا۔ دوسرے مصرع میں اپنے دعوے کو بحر کی مثال سے ثابت کیا ہے کہ سمندر اگر سمندر نہ ہوتا تو اس کی جگہ بیاباں ہوتا۔ اسی طرح ہمارا گھر اس وقت وفور اشک فشانی سے سمندر بنا ہوا ہے اگر سمندر نہ ہوتا تو ہماری صحرانوردی کی وجہ سے ویران ہو جاتا۔ (شرح دیوانِ غالب، یوسف سلیم چشتی، ص ۳۵۳)

شرح-۵

دن رات کی گریہ وزاری کا سمندر میرے گھر کو بہا لے گیا۔ ویران وتباہ کر گیا لیکن ایسا نہ ہوتا تو بھی میرے گھر کی ویرانی وتباہی میرا مقدر تھی۔ یہ اگر سمندر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا۔ طبعی جغرافیہ کی تاریخ بتاتی ہے دُنیا نے بڑے بڑے انقلاب دیکھے ہیں آج جہاں جہاں سمندر ہے وہاں بیاباں وریگستاں تھے۔ اس بات کی روشنی میں غالب کے خیال کو دیکھئے تو اُن کی متخیلہ پر حیرت ہوتی ہے۔ (شرح ومتن غزلیاتِ غالب، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ص ۸۴)

☆ جدید زمانے میں جغرافیائی وسائنسی صداقتوں کے انکشافات کے بعد اس شعر کے اندر موجود معنوی پرتیں تحیر انگیز ہیں۔ میرے نقطہ نظر سے اس شعر میں غالب کہتے ہیں کہ ہم روئیں چاہے نہ روئیں ہمارے گھر کا برباد، اُجاڑ اور ویران ہونا مقدر ہو چکا تھا۔ اگر یہ ویرانی صحرا کی صورت میں نہ ہوتی تو کسی بحر کی صورت میں ہوتی یا پھر کسی سمندر کی صورت ہوتی کیونکہ جغرافیائی براعظمی تبدیلیوں کے نظریئے کے مطابق زمین اپنی ماہیت میں دو ہی لبادے / چغے / آثار رکھتی ہے یا تو پانی کے حصے ہیں یا پھر خشکی کی سطحیں ہیں۔ اس نظریئے کے مطابق زمین اور سمندر اپنی جگہیں تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ دور جدید کے سائنس دان ان جغرافیائی تبدیلیوں کی تصدیق کر چکے ہیں۔ اس

نظریہ کی روشنی میں اس وقت جہاں فلک پوش ماؤنٹ ایورسٹ موجود ہے جغرافیائی تبدیلیوں کی تاریخ میں کبھی یہاں سمندر تھا۔ ایورسٹ کی چٹانوں سے بعض ایسے آثار ملے ہیں جن سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہاں کی چٹانیں سمندر کی چٹانوں سے مشابہ ہیں۔ برصغیر پاک و ہند بھی جغرافیائی تبدیلیوں کے نتیجے میں جنوبی افریقہ سے الگ ہوا ہے وگرنہ ماضی میں یہ دونوں خطے ایک تھے۔

شعر نمبر (۲)

ضعف سے گریہ مبدل بہ دم سرد ہُوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

(دیوان غالب، غزل نمبر ۴۹، شعر نمبر ۵)

شرح-۱

یعنی مسئلہ استحالہ عناصر پہلے ہماری سمجھ میں نہ آیا تھا، اب امتحاں ہوگیا تو باور ہوگیا۔ (شرح دیوانِ اردوئے غالب-سید علی حیدر نظم طباطبائی، ص ۴۸)

شرح-۲

باور آیا، باور آمدن (محاورہ فارسی) کا ترجمہ ہے، باور ہونا بھی بولتے ہیں، دم سرد بہ معنی آہِ سرد فرماتے ہیں۔ کمزوری اور ناتوانی کی وجہ سے ہم رو نہیں سکتے اس لیے وہ گریہ آہِ سرد میں تبدیل ہوگیا اور اس سے ہمیں یقیں ہوا کہ عناصر اپنی شکل بدل لیتے ہیں اور پانی ہوا کی شکل میں تبدیل ہوسکتا ہے، پانی مرئی ہوتا ہے اور ہوا غیر مرئی ہوتی ہے۔ (شرح دیوانِ غالب- جوش ملسیانی، ص ۱۲)

شرح-۳

ہماری کمزوری اور ناتوانی اس حد پر پہنچ گئی کہ رونے کی کوئی صورت نہ رہی، اس کی جگہ ٹھنڈے سانس لینے اور سرد آہیں بھرنے لگے یعنی رونے نے دمِ سرد کی شکل اختیار کر لی۔ یہ بدیہی واقعہ دیکھ کر ہمیں یقیں ہوگیا کہ واقعی پانی شکل بدل کر ہوا کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ (نوائے سروش- غلام رسول مہر، ص نمبر ۱۷۷)

شرح-۴

غالب نے اس شعر میں استحالہ عناصر کو شاعرانہ رنگ میں ثابت کیا ہے (استحالہ عناصر سے مراد ہے ایک عنصر

مثلاً پانی کا دوسرے عنصر مثلاً ہوا میں تبدیل ہوجانا) کہتے ہیں کہ جب تک ہم میں طاقت تھی، رات دن روتے رہتے تھے مگر جب ضعف لاحق ہوا تو آنسو بہانے کی بجائے ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگے یہ دیکھ کر ہمیں اس بات کا یقین ہوگیا کہ واقعی پانی (گریہ) ہوا (دمِ سرد) میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ (شرح دیوانِ غالب-یوسف سلیم چشتی، ص ۳۹۸)

شرح-۵

ناتوانی کے سبب جب میرے آنسو آہِ سرد میں بدل گئے یعنی بند ہوگئے تو مجھے یقین ہوگیا کہ پانی واقعی ہوا بن کر اُڑ جاتا ہے تحلیل عناصر کے اس مسئلے سے میں پہلے بھی واقف تھا لیکن جب تک ذاتی تجربہ نہ ہوا تھا میں اس کا قائل نہ تھا اب جبکہ روتے روتے بسببِ ضُعف جسم کے پانی نے آنسو کے بجائے آہِ سرد کی صورت اختیار کرلی تو اس بات کو تسلیم کرنا ہی پڑا کہ پانی بصورت ابر ہوا بن کر اُڑ جاتا ہے۔ (شرح ومتن غزلیاتِ غالب - ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ص نمبر ۱۱۴)

☆ غالب کے اس شعر کی شرح میں تقریباً سبھی شارحین کا تشریحی موقف یکساں دکھائی دیتا ہے لیکن عناصر کی تبدیلی کے سلسلے میں سائنسی مشاہدے اور تجربے کا یقین ان کی تشریح میں نمایاں طور پر دکھائی نہیں دیتا۔ میرے نزدیک غالب کا یہ معروف شعر اس کے سائنسی شعور کی اس لحاظ سے دلالت کرتا ہے کہ اس میں اس نے بڑی سادگی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ ضعف/کمزوری کی وجہ سے آنسو گہری اور ٹھنڈی آہوں میں تبدیل ہوگئے ہیں۔ اس تبدیلی کو دیکھتے ہوئے ہمارا یقین پختہ ہوتا ہے کہ پانی بھاپ یا بخارات کی شکل میں بھی تبدیل ہوجاتا ہے۔ گویا بخارات کا بننا ایک طبعی سائنسی عمل ہے اور اس عمل کی صداقت دن کی روشنی کے ساتھ ساتھ رات کی تاریکی میں بھی پرکھی جاسکتی ہے۔ جدید سائنس کے اُردو دنیا میں انکشافات سے بہت پہلے غالب اس طبعی حقیقت کو اپنے اشعار میں پیش کرکے اپنے سائنسی طرزِ فکر کو شاعرانہ صداقتوں سے ہم آہنگ کرچکے تھے۔

شعر نمبر (۳)

ہر قدم دوریٔ منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے
(دیوانِ غالب، غزل نمبر ۱۹۱، شعر نمبر ۱)

شرح-۱

یعنی بیاباں جس چال سے بھاگ رہا ہے وہ میری سی ہی چال ہے کہ جتنا میں چلتا ہوں اتنا ہی راستہ دور ہوتا جاتا ہے اور ہر ہر قدم پر دوریٔ منزل بڑھتی جاتی ہے۔(شرح دیوانِ اُردوئے غالب، سید علی حیدر نظم طباطبائی، ص ۲۲۶)

شرح-۲

یعنی جس رفتار سے میں چل رہا ہوں اسی رفتار سے بیاباں بھی میرے آگے آگے بھاگ رہا ہے اس لئے میری رفتار سے ہر ایک قدم پر دوریٔ منزل نمایاں ہو رہی ہے کیونکہ جو قدم اُٹھاتا ہوں بیاباں بھی اتنا آگے نکل جاتا ہے اور منزل بھی اتنی آگے ہو جاتی ہے۔ مسافت طے ہو تو کیونکر ہو۔ (شرح دیوانِ غالب، جوش ملسیانی، ص ۳۱۳)

شرح-۳

میری منزل مجھ سے ہر قدم پر دور ہوتی جا رہی ہے۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ جہاں پہنچنا ہے، پہنچ جاؤں لیکن مقامِ مقصود اُتنا ہی بعید ہوتا جا رہا ہے۔ جتنا میں اس کے نزدیک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوں اُس کا سبب یہ ہے کہ بیاباں اُسی رفتار کے مطابق مجھ سے بھاگ رہا ہے۔ جس رفتار سے میں اس کے قریب پہنچنا چاہتا ہوں۔ اس شعر میں مرزا نے نظر کے التباس واشتباہ کا وہ معاملہ پیش کیا ہے، جس کا تجربہ اکثر اشخاص کو ہوتا ہے، لیکن عموماً اس کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ فرض کیجئے کہ آپ ریل یا کسی دوسری سواری میں بیٹھے ہیں۔ وہ جتنی تیز چلے گی یہی احساس ہوگا کہ سواری ٹھہری ہوئی ہے اور اردگرد کی زمین تیزی سے پیچھے کی طرف دوڑی جا رہی ہے، تیز دوڑنے والے شخص کو اسی قسم کا التباس ہوتا ہے۔ چنانچہ مرزا فرماتے ہیں کہ میں جتنا منزل کی طرف دوڑتا ہوں، عام التباس اور اشتباہ کی بنا پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منزل مجھ سے دوڑی جا رہی ہے، لہذا میری تیز رفتاری سے منزل کی دوری کا معاملہ واضح ہے۔ (نوائے سروش، غلام رسول مہر، ص ۶۱۵-۶۱۷)

شرح-۴

بات تو معمولی ہے مگر کہنے کا انداز دلکش ہے کہتے ہیں کہ قاعدہ یہ ہے کہ مسافر کا ہر قدم اسکی منزل کو نزدیک کر دیتا ہے مگر میری بدقسمتی دیکھو کہ جس قدر آگے بڑھتا ہوں منزل اُسی قدر دور ہوتی جاتی ہے۔ (شرح دیوانِ غالب، یوسف سلیم چشتی، ص ۶۱۷)

شرح-۵

میری نارسائی اور ناکامی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ میرا قدم جتنا آگے بڑھتا ہے اتنی میری منزل کا فاصلہ زیادہ ہو جاتا ہے اور میری رفتار جتنی تیز ہوتی ہے اُس سے بھی زیادہ تیزی سے بیاباں مجھ سے دور بھاگتا ہے یعنی میری کامیابی میری کوششوں سے دور ہی دور رہتی ہے۔ (شرح و متن غزلیاتِ غالب، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ص ۳۶۰)

☆ جب کہ میرے نزدیک اس شعر میں غالب نے فزکس کے کلیہ تھیوری آف ریلیٹیویٹی (Relativity) کو بیان کیا ہے۔ یہ ایک عام مشاہدے میں آئی ہوئی بات ہے کہ اگر کوئی چیز حرکت کرتی ہے تو اس کی حرکت کا اندازہ قریب کی ساکن چیزوں کے ٹھہراؤ سے ہوتا ہے۔ مثلاً ریل گاڑی کے متحرک ہونے کا اندازہ پلیٹ فارم کے ساکن ہونے سے لگایا جاتا ہے۔ اسی طرح سے کار کی رفتار کا اندازہ قریبی درختوں، عمارات اور دیگر ٹھہری ہوئی چیزوں سے جو سڑک کے دورویہ موجود ہوتی ہیں، سے لگایا جاتا ہے۔ غالب کہتے ہیں وہ اپنے اٹھائے گئے ہر قدم کو دوریٔ منزل کے پیمانے سے ماپتے ہیں۔ غالب کے شارحین ماسوا غلام رسول مہر، اس شعر کے سائنسی مکاشفے سے دور رہے ہیں اور انہوں نے اپنی اپنی تاویلات اور تعبیرات کی ہیں جب کہ شاعر کا کہنا ہے کہ صحرا میں پیچھے رہ جانے والے قدموں کا تعین دوڑنے والے کی رفتار سے کیا جاتا ہے۔ اگر وہ تیز رفتاری سے بھاگے گا تو صحرا بھی اسی تیز رفتاری سے کم ہوتا جائے گا (پیچھے ہٹتا جائے گا) اور منزل بھاگنے والے کے قدم چومنے کے لیے اور بھی قریب ہوتی جائے گی۔

شعر نمبر (۴)

جُز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جُز وہم نہیں ہستیٔ اشیاء میرے آگے

(دیوانِ غالب، غزل نمبر ۲۰۹، شعر نمبر ۳)

شرح-۱

یعنی عالم کا نام ہے صورت اس کی مرئی و مبصر نہیں۔ یہ فلسفہ اور تصوف کا غریب مسئلہ ہے کہ اجسام بھی بذاتہا محسوس نہیں ہیں مفصل تقریر یہ ہے کہ اگر ذاتِ باری تعالیٰ کے سوا کسی شے کو موجود سمجھیں تو وہ موجودات یا تو مجردات ہیں جیسے نفوس یا ملائک وغیرہ اور یا اجسام ہیں، جیسے اپنے زعم میں ہم سمجھے ہوئے ہیں کہ ہم دیکھ رہے ہیں مثلاً پہاڑ یا نقوش و اجسام کے اعراض بین مثلاً نفس کا علم و ارادہ اور جسم کا رنگ و شکل ان سب چیزوں میں مجردات اور ان کے

اعراض کا نامحسوس ہونا تو بہت ظاہر ہے۔اب رہے اجسام اوران کے اعراض تو اجسام محسوس نہیں ہیں اگر محسوس ہیں تو اعراض محسوس ہیں مثلاً پہاڑ میں جس چیز کو ہم جسمِ کوہ اور ذاتِ کوہ کہتے ہیں اور جسے بذاتہ قائم سمجھتے ہیں وہی چیز ہمیں نہیں دکھائی دیتی۔دکھائی کیا دیتا ہے کہ پہاڑ کا اور اسی رنگ کی چوڑان اور لمبان اور پھیلاؤ اور یہ ظاہر ہے کہ رنگ ذات سے زائد وخارج ہے۔رنگ بدلنے سے گرگٹ نہیں بدل جاتا اور رنگ کے لیے قیام ذاتی نہیں ہے بلکہ اس کی ہستی جسم کے ضمن میں ہے اگر جسم نہ ہوتو رنگ کا وجود ہی نہیں ہوسکتا۔غرض یہ کہ آنکھ سے رنگ کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا اور روشنی کو بھی ایک قسم رنگ کی، پہلے سمجھتے تھے اور اب فلاسفۂ یورپ نے اس بات کو ثابت کر دیا کہ رنگ جسے تم سمجھتے ہو کہ دکھائی دیتا ہے یہ اصل میں ایک نوع کی روشنی ہے اور روشنی ایک قسم کا تموج وارتعاش ہے اور کچھ بھی نہیں۔ اسی طرح صدا جسے ہم سمجھتے ہیں کہ سنائی دیتی ہے وہ بھی ہوا کا ارتعاش ہے۔اس کی ہستی بھی ضمنِ غیر میں ہے اور وہ ہوا کی ذات کے علاوہ ہے یا جس لمس سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہوا محسوس ہے، یہ دھوکہ ہے، اس کی خنکی محسوس ہوتی ہے اور خنکی ہوا کی ذات سے الگ ہے اور اس کا وجود بھی غیر مستقل ہے۔اسی طرح چھُونے سے نرمی، سختی، ملائمت، خشونت جو کچھ محسوس ہوتی ہے یہ جسم کی ذات نہیں ہے، اسی قیاس پر بُو وذائقہ کو بھی سمجھ لو۔حاصل یہ ہوا کہ باتفاق تمام صوفیہ وفلاسفہ عالم اجسام ہرگز محسوس نہیں ہے۔ہاں اس کے کچھ اعراض وآثار محسوس ہیں لیکن یہاں سے فلاسفہ و صوفیہ کی راہ بدل گئی۔فلاسفہ یہ کہتے ہیں کہ اعراض کے لیے ہر قسم کی ہستی ہے گو وہ قائم بالغیر سہی اور صوفیہ کہتے ہیں کہ یہ محض اعتبارات واوہام ہیں۔بس دریا ہی دریا ہے۔موج وحباب کی تفصیل ذہن کے اوہام میں سے ہے جیسے فلک کے لیے فوقیت اور ارض کے واسطے تحسیّت ذہن نے اختراع کر لی ہے، ورنہ فلک وارض کے سوا فوقیت وتحسیّت کوئی ہستی نہیں رکھتی اور اس کے سبب فلاسفہ بھی قائل ہیں کہ ذہن انتزاعات واضافات کو بھی موجود سمجھتا ہے۔خلاصہ یہ کہ فلاسفہ کی رائے میں چند اعراض کے سوا محسوس مشاہد کچھ نہیں ہے اور یہ اعراض بھی بذاتہا قیام وجود سے عاری ہیں اور صوفیہ کہتے ہیں کہ ان کے لیے جس قدر ہستی کے تم قائل ہو یہ بھی محض ہے۔ان کے نزدیک عالم کی اصل یہ ہے کہ وحدت متحیر ہوئی، نقطہ پیدا ہوا، نقطہ متحرک ہوا، خط پیدا ہوا، خط کی حرکت سے سطح اور سطح کے تموّج سے عالم اجسام ظاہر ہوا اور اسی قسم کا عالم محض وہمی چیز ہے یہ معنی ہیں اس مصرع کے۔جزو ہم نہیں ہستیٔ اشیاء میرے آگے۔دوسری نظر اس شعر میں یہ ہے کہ منظور عربی لفظ ہے لیکن جس معنی پر غالب نے اسے باندھا ہے اس معنی پر عربی میں اس کا استعمال نہیں ہے ایک شعر نون کی ردیف میں گزر چکا ہے۔

شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

یہاں بھی منظور کو مرئی و مبصر کے معنی پر لیا ہے مگر محاورہ اس کے مساعد ہیں۔ (شرح دیوانِ اُردوئے غالب، سید علی حیدر نظم طباطبائی، ص ۲۴۹)

شرح-۲

یعنی جہان کی وجودی صورت صرف نام ہی نام ہے اور تمام وجودی چیزوں کی ہستی وہم ہی ہے۔ ذاتِ الٰہی کے سوا میں کسی کی ہستی کا قائل نہیں۔ (شرح دیوانِ غالب، جوش ملسیانی، ص ۳۳۶)

شرح-۳

میں دنیا کے وجود کو حقیقتاً کچھ نہیں سمجھتا، محض ایک نام ہے، جو اس کے لیے رکھ دیا گیا ہے، مسمیٰ کچھ نہیں اسی طرح اشیاء کا وجود بھی میرے لئے وہم سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ مولانا طباطبائی فرماتے ہیں کہ تصوف کے نزدیک اجسام بالذات محسوس نہیں ذات باری تعالیٰ کے سوا کسی شئے کو موجود سمجھیں تو یہ موجودات یا تو مجردات ہوں گے، جیسے نفوس، ملائک وغیرہ یا ہمارے تصور کردہ اجسام ہوں گے۔ ہم نفوس و اجسام کے صرف اعراض دیکھتے ہیں مثلاً نفس کا علم و ارادہ، جسم کا رنگ اور شکل۔ مجردات کا نامحسوس ہونا تو ظاہر ہے، رہے اجسام تو محض ان کے اعراض محسوس ہوتے ہیں، مثلاً پہاڑ ہیں جس شئے کو ہم جسم کوہ یا ذاتِ کوہ کہتے ہیں وہ تو دکھائی نہیں دیتی۔ صرف پہاڑ کا رنگ، اس کی لمبائی، چوڑائی اور پھیلاؤ نظر آتا ہے یہ سب اعراض ہیں۔ رنگ کے متعلق بھی فلاسفۂ یورپ نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ دراصل روشنی کی ایک نوع ہے اور اس نوع کا خاص تموج وارتعاش ہمیں نظر آتا ہے۔ اسی طرح آواز بھی ہوا کا ایک ارتعاش ہے۔ غرض اجسام کا حقیقی وجود کوئی نہیں اور اعراض ہمارے اوہام کی تخلیق ہیں، لہذا ثابت ہوا کہ جس شئے کو ہم عالم کہتے ہیں وہ محض ایک نام ہے اور اشیاء کی ہستی محض ایک وہم ہے۔

بجنوری مرحوم نے لکھا ہے کہ ہندو اپنشدوں کی قدیمی تعلیم کا مفہوم غلط سمجھتے ہوئے عالم کو ایک فریبِ نگاہ اور دشتِ سراب سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ایک خواب ہے جو چشم کور عالمِ رویا میں دیکھتی ہے۔ مرزا غالب کی عقل اس مغالطے سے آزاد ہے۔ وہ ہستی کو ہمیشہ مادے کے معنی میں استعمال کرتے ہیں لیکن وہ مادے کے منکر ہیں۔ اگرچہ

عالم اجسامِ خارجی سے لبریز نظر آتا ہے۔ اور نہایت لطیف گیسوں سے نہایت بھاری دھاتوں تک ہر شے اس میں موجود ہے، لیکن مادے کا وجود خود محض بالنسبت ہے، بالذات نہیں، زندگی کی جیتی جاگتی، چلتی پھرتی تصویریں، حرکات اصوات، الوان کوئی وجود نہیں رکھتیں، جب تک ذہن ان کا ادراک نہ کرے تمام مادہ جس میں خود میرا جسم اور بنی نوع کے اجسام شامل ہیں، بے جان اور بیکار ہے۔ وہ روح، وہ رواں، وہ خیال جو ان پر فاعل ہے، حقیقت ہے، غالب کا فلسفہ سپنوزا، ہیگل، برکلے اور فشطے سے ملتا ہے۔ حکمت کی رو سے مرزا کا خیال صحیح ہے۔ مادہ سالمات سے مرکب ہے، اگر پانی کے ایک قطرے کو کرہ ارض کے برابر خیال کریں تو اس کے سالمات چوگان کے گیند سے بڑے ہوں گے۔ یہ خود اجزاء سے مرکب ہیں جواب لایتجزیٰ خیال نہیں کیے جاتے بلکہ جواہرِ برق سے مرکب مانے جاتے ہیں۔ ہر جز کو اگر ایک کلیسا سے مشابہ کریں تو بقول سر آلیور لاج یہ جواہر کلیسا میں اُڑتی ہوتی مکھیوں کی مثال ہیں اگر ان کی تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ ایتھر کے حلقوں کی ساخت ہیں اگر ان حلقوں کی گرہ کھل جائے تو محض خیال باقی رہ جائے یوں مرزا غالبؔ کا یہ شعر از روئے فلسفہ وحکمت بھی درست ثابت ہوگا۔ (نوائے سروش، غلام رسول مہر، ص ۶۶۳-۶۶۵)

شرح-۴

منظور، اس لفظ کے دو معنی ہیں ۱۔ مشہود یا مری یا مبصر۔ غالب نے اس لفظ کو یہاں اسی مفہوم میں استعمال کیا ہے یعنی عالم کی صورت مجھے نظر نہیں آتی۔ ۲۔ بمعنی مُسلم مثلاً یہ بات مجھے منظور نہیں ہے اُردو زبان میں لفظ منظور دوسرے معنی میں مستعمل ہے۔ یہ لفظ اس سے پہلے اس شعر میں آچکا ہے۔

شاہد ہستی مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

لفظ وہم کے کئی معنی ہیں۔

(الف) اُردو زبان میں وہم بمعنی مراق، شک وشبہ، غلط خیال، گمان فاسد، فرضی یا خیالی بات مستعمل ہے۔ مثلاً کہتے ہیں کہ تمہیں تو وہم ہو گیا ہے یا وہم کی دوا لقمان کے پاس بھی نہیں ہے۔

(ب) منطق کی اصطلاح میں وہم اس حسنِ باطنی کو کہتے ہیں جس کا کام معانی جزئیہ کا ادراک کرنا ہے۔ منطق کی کتابوں میں وہم کو تصور خارج کی ایک قسم قرار دیا گیا ہے اور اس کی منطقی تعریف یہ ہے۔ مرجوحیت کے ساتھ نسبت خبریہ کا ادراک علی وجہ الحکایۃ۔

(ج) فلسفہ تصوف میں یہ لفظ دو معنی میں مستعمل ہے۔ ۱۔ وہمی اختراع یعنی ایک بے سر و پا یا من گھڑت بات جس کا منشا خارج میں موجود نہ ہو مثلاً گدھے کے سینگ یا گھوڑے کے پر یا چڑیل کے دانت۔ واضح ہو کہ کوئی صوفی کائنات کو ان معنوں میں وہمی نہیں کہتا۔ ہاں سوفسطائی کائنات کو اس معنی میں وہمی کہتے ہیں۔ ۲۔ واہمی واقعی یعنی وہ شے جس کا وجود اگرچہ خارج میں مستقل یا بالذات نہ ہو مگر اس کا منشاء خارج میں واقعی موجود ہو جس سے اس کے وجود کو منتزع کیا جا سکے مثلاً فوقیت آسماں یا تحیت زمین کہ ان کا منشاء (آسمان اور زمین) خارج میں موجود ہے یا حلقہ آتشیں کہ اس کا منشاء یعنی شعلہ جوالہ خارج میں موجود ہے۔ صوفیہ جب کائنات کو وہمی کہتے ہیں تو اس سے مراد ان کی وہمی واقعی ہوتی ہے یعنی اگرچہ کائنات کا بذات خود کوئی مستقل وجود نہیں ہے مگر اس کا منشاء (یعنی ذات حق) درحقیقت خارج میں موجود ہے۔ چنانچہ علامہ محمود شبستری فرماتے ہیں:

ہمہ از وہم تست ایں صورتِ غیر
کہ نقطہ ، دائرہ ست از سرعتِ غیر

یعنی اگرچہ دائرہ کا وجود وہمی ہے مگر وہمی واقعی ہے کیونکہ وہ نقطہ خارج میں موجود ہے جس سے اس دائرہ کا وجود منتزع ہے۔ بالفاظِ دگر، اگرچہ دائرہ کا کوئی مستقل وجود نہیں ہے (وہ تو سرعتِ گردشِ نقط کا نتیجہ ہے) مگر خارج میں نظر ضرور آتا ہے۔

مطلب: اس شعر میں غالب نے وحدۃ الوجود کی تعلیم دی ہے۔ چونکہ اس مسئلہ کو مقدمہ میں بالوضاحت بیان کر دیا ہے اس لیے یہاں تفصیل غیر ضروری ہے۔ کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہستی حق کے سوا کسی شے کی ہستی حقیقی نہیں ہے۔ کائنات کی ہستی وہمی ہے یعنی اگرچہ موجود ہے مگر اس کا وجود، مرتبہ وہم سے آگے نہیں ہے بالفاظ دِگر، اس کا وجود حقیقی نہیں ہے۔ (شرح دیوانِ غالب، یوسف سلیم چشتی، ص ۸۰۵)

شرح-۵

اشیاء کا وجود میرے نزدیک ایک وہم ہے اور دنیا کے وجود کا بس نام ہی نام ہے۔ حقیقتاً کوئی وجود نہیں ہے۔ (شرح و متن غزلیاتِ غالب، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ص ۳۹۲)

☆ جدید سائنسی سوچ کے مطابق اس شعر کی تشریح یوں ہوگی، غالب کے مطابق دنیا کی اس حالت کو میں نے صرف نام کی حد تک ہی قبول کیا ہوا ہے۔ یہ کہ میرے لیے اس دنیا کی تمام اشیا کی حقیقت صرف قیاسی یا موہوم کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اس شعر کے اندر غالب نے مادے کی ماہیت میں تبدیلی کے پیچیدہ سائنسی عمل کو بڑی خوبصورتی

کے ساتھ بیان کیا ہے۔ غالب کے سوا کسی اور شاعر نے اس خوبصورتی کے ساتھ شعر کے لبادے میں اس سائنسی عمل کے بارے میں بات نہیں کی۔ سائنس کا شعور رکھنے والے لوگ جانتے ہیں کہ زمین جس کے بارے کہا جاتا ہے کہ وہ گول ہے، ممکن ہے کہ کچھ عرصے بعد اس کی شکل چپٹی ہونے کا انکشاف ہو، ٹھوس چیزیں خاص درجہ حرارت کے بعد خاک میں تبدیل ہو جاتی ہے، یہ دلالت کرتی ہیں اس بات کی کہ کوئی بھی چیز ہمیشہ کے لیے ایک ہی شکل میں نہیں رہ پاتی۔ ہر چیز کے اندر تبدیلی کا عمل جاری و ساری رہتا ہے۔ دریا ہوں، پہاڑ ہوں یا انسانی نسل ہو، تبدیلی کا عمل مسلسل رہتا ہے۔ یہ درست ہے کہ مادہ مستقل ہے لیکن اپنی اشکال تبدیل کرتا رہتا ہے۔ اس ساری صورت حال کو دانش مندی اور ہوش مندی کے ساتھ بغور مشاہدہ کرنے کی ضرورت ہے اور غالب وہ ہوش مند شاعر ہے جن کے مشاہدے نے سائنسی صداقتوں کو شعری آہنگ عطا کیا ہے اور اس طرز کے مطالعہ سے غالب کے اشعار میں معنی کی کچھ اور پرتیں نئے زمانے میں ہم پر آشکار ہوئی ہیں۔

حواشی وحوالہ جات

(۱) الطاف حسین حالی، یادگارِ غالب، (اولین اشاعت ۱۸۸۷ء)، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۱۹۸۶ء۔

(۲) عبدالرحمٰن بجنوری، محاسن کلام غالب، اولین اشاعت، ۱۹۲۱ء

(۳) Hamid Ali "Scientific Aspects in Poetry" The DAWN (Sunday Magazine) March 16, 2003

(۴) David Daiches Critical Approaches to Literature, Longmans, Green & Company Ltd, London w.1 (1967) page 129-142.

(۵) دیوانِ غالب، (صد سالہ اشاعت، کلیات غالب) لاہور، ۱۹۸۰ء۔

(۶) جوش ملسیانی، شرح دیوانِ غالب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء۔

(۷) غلام رسول مہر، نوائے سروش، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، سن ندار۔

(۸) فرمان فتح پوری، شرح و متن غزلیاتِ غالب، بیکن بکس گلگشت، ملتان، ۲۰۰۰ء۔

(۹) نظم طباطبائی، شرح دیوانِ اُردوئے غالب، انور بک ڈپو، لکھنؤ، ۱۹۵۴ء۔

(۱۰) یوسف سلیم چشتی، شرح دیوانِ غالب، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، سن ندارد۔

☆ راقم الحروف